R. No. 2186/57 — Regd. No. L922.

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

یوم اشاعت
۲۲-۱۲-۱-۱

ٹیلیفون - ۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ دس نئے پیسے

جلد ۲۲ - شمارہ ۴۸	ایڈیٹر - آل احمد سرور	۲۲ دسمبر ۱۹۶۳ء

اداریہ

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ پر پارلیمنٹ میں بحث

لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی پانچویں رپورٹ پر راج سبھا میں دو دن بحث ہوئی۔ کمشنر نے اپنا کام خاصی محنت سے انجام دیا ہے اور رپورٹ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ابھی تک ریاستی حکومتوں کا رویہ عام طور پر لسانی اقلیتوں کی جائز شکایات کے سلسلے میں اچھا نہیں ہے۔ خصوصاً اتر پردیش کی حکومت کئی معاملات میں کمشنر کے بار بار توجہ دلانے کے باوجود خاموش ہے اور جہاں کمشنر کی سفارش اُس نے مان بھی لی ہے وہاں اس پر عمل بہت سُستی سے ہو رہا ہے مثلاً بہت کم اسکولوں میں داخلے کی پیشگی رجسٹری کے لئے رجسٹر رکھا گیا ہے۔ ثانوی درجے پر اردو ذریعۂ تعلیم کے سلسلے میں صاف انکار ہے۔ اُن ابتدائی اسکولوں کی تعداد بہار کے مقابلے میں بھی کم ہے جن میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ ممبروں نے کمشنر کے کام کو سراہا۔ کئی اشخاص نے اُسے زیادہ اختیارات دینے پر زور دیا۔ ہم بھی اس کے حق میں ہیں۔ ہمارے خیال میں کمشنر کو ہر ریاست کے لئے ایک اسسٹنٹ کمشنر مقرر کرنا چاہئے اُس کے اسٹاف زیادہ ہونا چاہئے اور اُس کی سفارشات پر صدر جمہوریہ کو مناسب احکام صادر کرنے چاہئیں۔

شری ہجرنویس وزیر امور داخلہ کی تقریر میں کئی باتیں اہم تھیں۔ اُنہوں نے اسے تسلیم کیا کہ ملک میں سب سے بڑی لسانی اقلیت اُردو والوں کی ہے۔ اُنہوں نے یاد دلایا کہ ۱۹۵۸ء میں ریاستی حکومتوں کو ابتدائی اور مڈل کے درجوں میں اردو کو باقی رکھنے کے لئے اور سرکاری دفتروں میں اُردو میں کاغذات لینے کے لئے ہدایات جاری کی گئی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر مرکز سے درخواست کی گئی تو وہ خاص خاص شکایات پر ریاستی حکومتوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد خود کارروائی کرے گا نیز پارلیمنٹ میں جو تقریریں ہوئی ہیں وہ تمام ریاستوں کو بھیجی جائیں گی۔ اُنہوں نے یہ بھی صاف کہا کہ ریاستی حکومتوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنی لسانی اقلیتوں کی شکایات کو دور کریں۔ ان سب باتوں سے ایک صاف اور کھلے ذہن کا پتہ چلتا ہے اور یہ اُمید بندھتی ہے کہ مرکز لسانی اقلیتوں کی شکایات کے سلسلے میں آئندہ زیادہ مثبت رویہ اختیار کرے گا۔

مگر ہماری سمجھ میں شری ہجرنویس کا یہ مشورہ نہیں آیا کہ لسانی اقلیتوں کو اپنی تعلیم اور ملازمت کے لئے اپنی ریاست کے باہر کسی کی طرف نہیں دیکھنا چاہئے۔ انہیں پہلے ریاستی حکومت سے ہی اپیل کرنی چاہئے کیونکہ باہر کے اصحاب تک جانے میں انہیں کے مقصد کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ کیا وزیر موصوف مرکز سے اپیل کو غلط سمجھتے ہیں۔ کیا اُن کے نزدیک مرکز کا یہ فرض نہیں ہے کہ دستور کی دفعہ ۳۵۰ الف کی پابندی ریاستی حکومتوں سے کرائے اور کیا مرکزی حکومت کوئی غیر ہے جس سے رجوع کرنے میں ریاستی حکومتوں کے عتاب کا خطرہ ہے۔

ہم موصوف کے اس مشورے کو غلط سمجھتے ہیں۔ لسانی اقلیتوں کو جب شکایت ہوتی ہے تو پہلے وہ ریاستی حکومتوں کو ہی توجہ دلاتی ہیں مگر اُن کا یہ تجربہ ہے اور کمشنر کی کئی رپورٹوں نے اس تجربے پر مہر لگا دی ہے کہ یہ حکومتیں اپنے فرض سے عموماً غافل ہیں۔ اس لئے مرکز کا یہ فرض ہے

اِس اشاعت میں

کروہ ریاستی حکومتوں سے دستور کی لفظاً اور معنیً ہر طرح پابندی کرائے۔ ریاستی حکومتوں کو یہ احساس نہیں دلانا چاہیے کہ وہ لسانی اقلیتوں سے جیسا چاہیں سلوک کر سکتی ہیں، اگر پارلیمنٹ اس مسئلے کو اہم نہ سمجھتی تو کمشنر کی رپورٹ اُس کے سامنے کیوں آتی یا صدر کے ملاحظے کے لئے کیوں پیش ہوتی خود کمشنر کا تقرر ہی اس ضرورت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ہماری رائے میں مرکز کو اس سلسلے میں اور چوکس رہنا چاہیے اور ریاستی حکومتوں کی ہر غفلت یا کوتاہی پر باز پرس کرنی چاہیے کیونکہ پورے ملک کے مفاد کو وہ ریاستی حکومتوں سے زیادہ سمجھتا ہے۔

سیر بین

ایک زمانے میں یہ سوال بہت پوچھا جاتا تھا کہ اُردو ادب میں جمود ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ کچھ لوگ جمود کے قائل تھے، کچھ حرکت کے۔ آخر ایک صاحب نے جھلا کر کہہ دیا کہ تم لوگ بحث کاہے کی کر رہے ہو، اُردو ادب کا تو انتقال ہو چکا۔ یہ کہہ کر وہ صاحب مراقبے میں چلے گئے۔

اسی طرح کی ایک بحث آج کل چھڑی ہوئی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے اُردو بلٹز کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ مژدہ سنایا کہ اُردو زبان ترقی کر رہی ہے۔ اس پر ہمارے ایک محقق کو غصہ آ گیا اور اُنہوں نے اعداد و شمار کی مدد سے ثابت کر دیا کہ اُردو ترقی کرنا تو کجا موت کے آغوش میں جا رہی ہے اور کچھ دنوں میں اس پر فاتحہ پڑھنا پڑے گی۔ پھر کیا تھا یاروں کو طبع آزمائی کے لئے ایک اچھا خاصا مصرعہ طرح ہاتھ آ گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب تک یہ کم بخت انجمن ترقی اُردو ہند موجود ہے، اُردو ترقی نہیں کر سکتی، کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ نظم بنتے رہیں، مشاعرے ہوتے رہیں، قوالیوں کی محفلیں جمتی رہیں، غزل کا ساز چھڑتا رہے، پھر اُردو زبان کا مستقبل محفوظ ہے۔ کچھ لوگ ریاستی حکومتوں کے ظلم و ستم کی داستان چھیڑتے ہیں، اُردو میں سائن بورڈ نہ ہونے اور اُردو فلم کے ہندی فلم کہلانے پر ماتم کرتے ہیں، ریڈیو پروگراموں میں اُردو کی نمائندگی کم ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اس زبان کا خدا ہی حافظ ہے۔

لطف یہ ہے کہ اس معرکے میں کچھ لال بجھکڑ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ ایک مشورہ دیتا ہے کہ اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا جائے بس پھر کیا ہے جس طرح مسلمانوں کے پرسنل لا میں دخل دینے کی ساری سازش ایک ڈانٹ میں بیٹھ گئی اسی طرح اُردو کے خلاف ساری صف آرائی ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ جائے گی۔ دوسرا کہتا ہے زبان باقی رکھنا ہے تو رسم خط بدل دو اور دیوناگری اختیار کر لو۔ گویا "دو درخ دیدہ۔ ورنہ ولادام سے ہاتھ دھونا پڑیں گے"۔ تیسرا کہتا ہے کہ کانگریس ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ مخالف پارٹیوں سے رشتہ مضبوط کر لو، اُردو کو اس کے سارے حقوق مل جائیں گے۔

سیر بین لکھنے والا یہ سیر دیکھ رہا ہے اور برسوں پہلے پڑھا ہوا ایک قصہ اُسے یاد آ رہا ہے۔ امریکہ میں صدر کا انتخاب درپیش تھا۔ ایک امیدوار نے مستقبل کے لئے اپنا پروگرام پیش کیا۔ صدر ہونے پر وہ یہ کرے گا، وہ کرے گا، ٹیکس کم ہو جائیں گے، کام کرنے کا وقت کم ہوگا، اتنے نئے کارخانے کھولے جائیں گے، اتنے دشمنوں سے بدلہ لیا جائے گا، دنیا جنت ہو جائے گی۔ دوسرے امیدوار نے اپنی تقریر میں پانچ سال پہلے کوئلے کی پیداوار، لوہے کی پیداوار، انکم ٹیکس کی آمدنی، زراعت کی آمدنی، صنعتوں کی آمدنی کے اعداد دیئے اور اُن کا مقابلہ اُس سال کے اعداد سے کیا جہاں جہاں کمی تھی وہ مخالف پارٹی کے متھے مڑھی۔ دوسرا امیدوار جیت گیا۔

بات یہ ہے کہ ہم لوگ سیاہی اور سفیدی کی لکیروں کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم رات اور دن کو سمجھتے ہیں، صبح و شام کو نہیں سمجھتے۔ سفید اور کالے رنگ کو پہچانتے ہیں، بھورے اور مٹیالے رنگوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک انسانیت کو زوال ہو رہا ہے کچھ کے نزدیک عروج، کچھ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان ترقی کر رہا ہے کچھ جھٹ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ وہ زوال کی طرف جا رہا ہے۔ اسی طرح اُردو کے متعلق فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اُردو کے سلسلے میں دوسری زبانوں کی طرح ترقی اور زوال دونوں کی قوتیں کام کر رہی ہیں، کچھ باتوں میں یقیناً ترقی ہو رہی ہے، کچھ میں بلاشبہ زوال ہو رہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم معروضی طور پر حالات کا جائزہ لیں، جن پہلوؤں کے ساتھ ترقی وابستہ ہے اُن کو بڑھائیں اور نمایاں کریں، زوال کے اسباب پر غور کریں اور اس کا علاج کریں مگر اس کی فکر کسے ہے، ساری قوت تو ایک دوسرے پر اعتراض میں صرف کر دی جاتی ہے۔ اپنے اپنے دائرے میں کام کرنا مشکل ہے، سب پر اعتراض ہی کیا جاتا ہے۔ معترض کم سے کم خود کچھ کرنے سے تو بچ ہی جاتا ہے۔ پھر ترقی کا حامی صرف اپنے دائرے میں ترقی کو سب کچھ سمجھتا ہے، وہ دوسرے گوشوں کو دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔

خیر اس بحث کو یہیں چھوڑیئے۔ اقبال کے کچھ شعر پڑھیے

"کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند"

ہندی کے علاقے میں ثقافتی تعطل

اُردو کے عظیم شاعر فراق گورکھپوری کا ایک مضمون مندرجۂ بالا عنوان سے انگریزی کے روزنامہ ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے دلائل و براہین کے ساتھ اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ ہندی کے علاقے میں ثقافتی تعطل کے کیا اسباب ہیں اور غلط سلط ہندی کو ٹھونسنے اور اُردو کے ساتھ بدسلوکی کرنے سے خود ہندی کے حق میں کیسے کیسے خراب نتیجے نکلے ہیں۔ کیونکہ یہ مضمون ہندی اور اُردو دونوں ۔۔ دوستوں کے لئے چشم کشا اور نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہماری زبان کے قارئین کے لئے اس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

"ہندی کے علاقے میں سارا بہار، اُتر پردیش، دہلی، مدھیہ پردیش اور راجپوتانہ شامل ہیں، اور جہاں تک ہندی بالخصوص ہندی کے اُس روپ کا تعلق ہے جس کو عام طور پر اُردو یا ہندوستانی کہتے ہیں، بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ قریب قریب پورے آندھرا پردیش، پنجاب اور کشمیر جیسے صوبوں، بمبئی، پونا، احمد آباد، مدراس، میسور، بنگلور اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں اور آسام و نیپال جیسے دور دراز علاقوں میں بھی اس کا سکہ رائج ہے۔ ان میں سے بہت سے مقامات پر ہندی یا ہندوستانی خواہ عام طور پر بولی نہ جاتی ہو یا ٹوٹی پھوٹی شکل میں بولی جاتی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ عام طور پر سمجھی ضرور جاتی ہے۔ ہندی کا مرکزی علاقہ پٹنہ سے دہلی اور شمالی یو۔پی سے جبل پور تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ ہندی علاقہ آریہ ورت کا بھی مرکزی حصہ رہا ہے۔ اور یہی علاقہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا وسیع مستقر بھی رہا۔ یہیں سے وہ ثقافتی طاقتیں اُبھریں جو اپنی روانی اور بہاؤ کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں پورے ہندوستان پر چھا گئیں۔ اس علاقے کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ ایک لحاظ سے ہندوستان کا قوی ترین بازو اور ایک اعتبار سے کمزور ترین حصہ بھی رہا ہے۔

اسلام کے اُس خوفناک سیلاب کو یاد کیجئے اور اس کے مقابلے میں اس علاقے کی روحانی طاقت استقامت جانی قوت مقابلہ اور ثقافتی قدامت پرستی پر غور کیجئے کہ اسلام کی منظم یلغار اور ہندو ثقافت پر اس کی مسلسل حملہ آوری کے باوجود اس علاقے کی صرف دس فی صدی آبادی اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوئی، مگر نوے فی صدی سختی سے اپنے دھرم پر قائم رہی۔ ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس نے نہ صرف فوجی اور سیاسی اعتبار سے بلکہ ثقافتی اعتبار سے بھی ہندو دھرم کی مدافعت کا کام انجام دیا۔ یہ ہندی علاقہ جس کا طاقت ور مرکز دہلی رہا اسلام کی عظیم ترین فتح اور بد ترین شکست دونوں کا جلوہ گاہ رہا ہے۔

مشہور اُردو شاعر مولانا حالی اپنی مشہور مسدس مد و جزرِ اسلام میں کہتے ہیں کہ اسلام کا حجازی بیڑہ جس نے بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا، سات سمندر پار کر کے وادیِ گنگا کی بے پناہ گہرائی میں آ کر ڈوب گیا۔

دوسرا پہلو

اس علاقے کی نوے فی صدی آبادی نے ہندو مت کی رہی سہی طاقت کی حفاظت کے لئے اسلام کا مقابلہ کیا لیکن اس علاقے کی تاریخ کا ایک ڈرامائی پہلو اور بھی ہے اسلام نے بھی یہاں آ کر تہذیب و ثقافت کے میدان میں شاندار فتوحات حاصل کیں بڑے بڑے مسلمان بہادر اور فاتح عظیم مسلم حکمران اور تاریخی شخصیتیں بڑے بڑے نامور مسلم علما اور لغت داں اسی علاقے میں پروان چڑھے اور پھلے پھولے۔ مسلم فن تعمیر و سنگ تراشی، علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے اعلیٰ اور شاندار نمونے بھی اسی علاقے میں دیکھنے میں آئے۔ قریباً پانچ صدیوں تک اسلام کا طاقتور دباؤ ہندی ادب کی ترقی و اشاعت کا کام کرتا رہا۔ ملک محمد جائسی، کبیر، امیر خسرو، رحیم خانخاناں، رس خان اور لگ بھگ آٹھ سو ہندی کے مسلم شعرا نے ہندی کے لاثانی ہندو شعرا کے دوش بدوش اس علاقے کی ثقافتی زندگی کو ہندی شاعری کے انمول موتیوں اور جواہرات سے مالا مال کیا۔ اس علاقے میں ہندو مسلم تہذیب و ثقافت اُبھر رہی تھی۔ صورت یہ ہوئی کہ جس ہندی ادب نے یہاں عظیم کارنامے انجام دیئے وہ ہندی کے وہ روپ تھے جو سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے ترقی یافتہ دار السلطنت دہلی۔ کے علاقے میں بولی جانے والی زبان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔ ہندی کے جن روپوں میں صدیوں تک ہندی ادب پھلتا پھولتا رہا وہ اودھی، برج، بھوجپوری، راجستھانی اور جیسواری زبانیں تھیں، ہندی شاعری کا صرف نامعلوم سا جزو سنت ساہتیہ یا نرگنا اخلاقی، روحانی اور مذہبی شاعری کی صورت میں دار السلطنت کی زبان یا کھڑی بولی میں تھا۔

مذکورۂ بالا زبانوں کی شاعری کو ایک زمانے تک بڑا عروج رہا مگر آخر میں ان کا خاتمہ ہوتا چلا گیا۔ اب دہلی کی زبان جو سترویں اور اٹھارویں صدی میں ادبی تخلیقات سے محروم تھی روز بروز ترقی اور ارتقائی منزلیں

طاقت کے طاقتور سے طاقتور ہوتی چلی گئی، اور دہلی اور ہندی علاقے کے ہر شہر و قصبے کے بسنے والے سب مہذب اور سنجیدہ حضرات کی زبان اور زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئی۔ یہ زبان سماجی میل ملاپ اور آپس کی بول چال کا شائستہ ترین، اور مہذب ترین ذریعہ ثابت ہوئی۔ اس میں خالص ہندی کے الفاظ و محاورات اور لسانی اصطلاحات کی بھرمار تھی، اور عربی و فارسی کے صرف دو ہزار ایسے الفاظ تھے جو ہندی کے علاقے کے شہروں اور گرد و نواح میں بسنے والے ہندو مسلم عوام کی زبان کا جزو لاینفک بن گئے تھے۔ یہ زبان ہندی کے علاقے کے شہروں اور قصبوں کے لاکھوں باشندوں کی زبانوں پر لگ بھگ دس نسلوں تک بولے جانے کے بعد دہلی کی ابتدائی اردو شاعری کی شکل میں پہلے دکن میں پھر دہلی اور پورے علاقے میں پھلتی پھولتی چلی گئی۔ جہاں سے غیر کھڑی بولی کی ہندی شاعری کا زوال شروع ہوتا ہے وہیں سے اُردو کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

اس علاقے میں بلکہ پورے ہندوستان میں مسلم طاقت کے زوال کے ساتھ ساتھ اُردو کی ترقی اور عروج کا دور شروع ہوتا ہے۔ برطانی حکومت برسرِ اقتدار آ رہی تھی۔ اور ہند یورپی تہذیب جنم لے رہی تھی۔ اسی زمانے میں دوسری طرف برطانیہ کے بے حس اور تاجر حکمران لسانی، ثقافتی اور تہذیبی محاذوں پر "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی کامیاب سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ فورٹ ولیم کالج بظاہر تو ہندی علاقے کی مرکزی زبان کھڑی بولی کی ترقی و اشاعت کے لئے قایم کیا گیا تھا۔ مگر دوسری طرف ہندی روپ اور اردو طرز کی شکل میں اس زبان کے دو ٹکڑے کرنے کی عیارانہ و مفسدانہ کوششیں جاری تھیں۔

اس تحریک کے تباہ کن اثر کا لازمی نتیجہ ثقافتی اور سماجی تعطل کی شکل میں رونما ہونا تھا ہوا۔ چنانچہ ہندی علاقے میں ثقافتی رسّہ کشی یا تعطل پیدا ہو گیا۔ قریباً نصف صدی سے زیادہ موجودہ صدی کی پہلی یا دوسری دہائی تک علٰحدگی پسندی اور فرقہ واریت کا یہ خاموش زہر زبان و تہذیب کے تندرست جسم میں دھیرے دھیرے اپنا کام کرتا رہا مگر یہ عمل کم و بیش پس پردہ ہوتا رہا۔ اور اگر کہیں منظر عام پر بھی آیا تو اس کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

لیکن اصل اسٹیج پر اُنہی طاقتوں اور شخصیتوں کا قبضہ رہا جو جدید ہندوستان یا ہند یورپی تہذیب کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ طاقتیں تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہندی کے علاقہ میں ہند یورپی تہذیب انگریزی اور یورپی سائنس کی بالترتیب تعلیم سے اُبھری لیکن اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم اور ثقافت نے ایک نئی جلا بخشی اور اس سے ہندوستانی فاضلوں کا ایک نیا طبقہ عالم وجود میں آیا۔ ہندی کے علاقے میں اس نئی تہذیب کے نمایندوں نے ہماری قومی زندگی کی ہر منزل پر ہماری رہنمائی کی۔ ہم ان میں سے کچھ مشہور شخصیتوں کا نام لیتے ہیں جو اسی ہندی علاقے کی اولاد ہیں۔ مدن موہن مالویہ، بشمبر ناتھ، اجودھیا ناتھ کنزرو، اور ان کا بیٹا ہردے ناتھ کنزرو، سندر لال، موتی لال نہرو اور ان کا بیٹا جواہر لال نہرو، تیج بہادر سپرو، سچیدانند سنہا، راجیندر پرشاد، لاجپت رائے، سوامی رام تیرتھ، سوامی شردھانند، بشن نرائن در، ڈاکٹر بھگوان داس اور گنگا پرشاد ورما وغیرہ وغیرہ۔ ان کے بعد لگ بھگ پون صدی تک ممتاز وکیلوں اور پروفیسروں، مدرسوں، نامور شخصیتوں، ادیبوں اور شاعروں، صحافیوں اور سماجی اور تعلیمی ترقی کے لئے کام کرنے والوں کی ایک جماعت میدان میں آئی۔ اتنی ہی تعداد ہمارے ہم وطن مسلمان بھائیوں میں سے ممتاز اور نام آور شخصیتوں کی منظر عام پر آئی جن کے نام بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قومی تعمیر کے لئے ایک ماہر فن معمار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور ان میں کا ہر شخص ہند یورپی تہذیب یا انگریزی اُردو اور فارسی تمدن کی پیداوار تھا۔

اس نسل کی نمائندگی کرنے والا طبقہ گاندھیائی دور کی آخری دہائی میں ختم ہو گیا۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو جھنجھوڑنا اور جھٹکے دینا فائدہ مند ہوتا ہے۔ ایسے جھٹکے نہ صرف جسمانی اور دماغی بیماریوں کے لئے مفید ہوتے ہیں بلکہ ان سے سماجی خرابیوں کے دور کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس لئے ہمیں بڑی صفائی اور بے رحمی سے اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کیا انگریزی زبان و ادب سے دشمنی اور اُردو زبان و ادب سے تعصب و ہٹ دھرمی کرنے سے ہماری زبان، ذہنی صلاحیتوں اور ہماری تہذیب و ثقافت کو عام طور پر بے حد و بے اندازہ نقصان نہیں پہنچا۔ ہم نے ذہنی ترتیب اور تہذیب و ثقافت کے ان دو بڑے وسیلوں (انگریزی اور اُردو) کی جگہ اپنے اوپر ایک ایسی زبان لا دی ہے جس کو ہم ہندی کہتے ہیں، اور عوام کی زبان بتاتے ہیں۔ لیکن جو اصلی ہندی نہیں بلکہ نقلی ہندی ہے جس کی جڑیں عوام و خواص کسی کی بول میں نہیں ملتیں۔ اس نام نہاد زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نااہلی کے ساتھ سنسکرت کے تتسم الفاظ گھسیڑے جا رہے ہیں اور ہندی کے تدبھو الفاظ و محاوروں کا رفتہ رفتہ بائیکاٹ کیا جا رہا ہے۔ (باقی صفحہ ۱۰ پر)

غزلیں

اوجؔ یعقوبی

حادثے ہم سے گلے مل کے پشیماں ہوں گے
ہم بہ ہر دور حریفِ غمِ دوراں ہوں گے
کچھ شرارے تہِ خاکسترِ دل ہیں اب بھی
وہ سمجھتے ہیں کہ شعلے نہ فروزاں ہوں گے
رُخ ہواؤں کا بدلتا تھا ابھی جن کے لیے
کیا خبر تھی وہ سفینے تہِ طوفاں ہوں گے
ضبطِ فطرت کے تقاضوں سے نہ جیتے گا کبھی
قلب تڑپے گا تو آنسو سرِ مژگاں ہوں گے
تپنے دے اور ذرا آتشِ غم میں دل کو
جتنے جوہر ہیں بیک وقت نمایاں ہوں گے
غم مرتب ہو تو سنجیدگی آجاتی ہے
ورنہ دنیا میں کئی چاکِ گریباں ہوں گے
ساری دنیا تو نہ کھائے گی تبسم کا فریب
کچھ تو انداز شناسِ غمِ پنہاں ہوں گے
آپ زلفوں کو سنواریں کہ پریشاں رکھیں
ہونے والے تو بہر حال پریشاں ہوں گے
ہم تو خیر اہلِ وفا ٹھہرے ہمارا کیا ہے
آپ کو مشقِ جفا کم ہے پشیماں ہوں گے
درد جب دیتا ہے سانسوں کو بھی آہوں کا مزاج
اوجؔ انفاس نہ کیوں شعلہ بداماں ہوں گے

زوار حسین اخترؔ

اے دوست وہ آرامِ دل وجاں نہیں ملتا
وہ عقدہ کشائے غمِ دوراں نہیں ملتا
ہم بخیہ گرِ چاکِ گریباں تھے جنوں میں
"اب ہوش میں آئے ہیں تو داماں نہیں ملتا"
اک ساتھ سلگ اٹھتے ہیں بس جیب و گریباں
ڈھونڈو تو چراغ تہِ داماں نہیں ملتا
ساحل پہ ہے اک شور کہ ہم ڈوب رہے ہیں
موجوں میں بھی ہم کو کہیں طوفاں نہیں ملتا
ہے شکوہ بہ لب کوئی، کوئی مہر بہ لب ہے
اس بزم میں اخترؔ بھی غزلخواں نہیں ملتا

تاراچند باغیؔ

قطعہ

زیست میری خراب کس نے کی — یہ تو اک مختصر سا قصہ ہے
کچھ تو میرا بھی ہاتھ ہے اس میں — اور کچھ دوستوں کا حصہ ہے

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کی سرگرمیاں

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ نے اُردو تعلیم جائزہ مہم کا آغاز ۱۸ر نومبر ۱۹۶۳ء سے کیا ہے۔ اس مہم میں بیسک اسکولوں اور سہ لسانی فارمولے کے تحت جونیر ہائی اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ شہر لکھنؤ کو متعدد حلقوں میں تقسیم کرکے ہر حلقے میں جائزہ میٹنگ ہو رہی ہے۔ اس ہفتے میں اب تک تین حلقوں میں جلسے کئے جاچکے ہیں۔ پہلا جلسہ کٹرہ اعظم بیگ میں وسیم الدین قدوائی کی صدارت میں ہوا۔ دوسرا جلسہ اشرف آباد میں نقی کاظمی کے مکان پر سالک لکھنوی کی صدارت میں ہوا۔ تیسرا جلسہ شیخ عبداللہ کی صدارت میں عطر بلڈنگ منصور نگر میں ہوا۔ ان جلسوں میں مقامی ادبی انجمنوں کے ذمہ دار، شعراء اور ادیب، طلبہ اور ان کے سرپرست شریک ہوئے۔ انجمن ترقی اُردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے مادری زبان کی اہمیت، لکھنؤ میں اردو طلبہ کی تعداد، سہ لسانی فارمولے کے تحت کارپوریشن اور ضلع پریشد کے اسکولوں میں اُردو تعلیم کے خاتمے پر روشنی ڈالی، اور اپیل کی کہ اُردو کے ایک ایک نام لیوا کا فرض ہے کہ وہ اُردو تعلیم جاری کئے جانے کی مسلسل جدوجہد کرتا رہے، اس سلسلے میں جو دشواریاں ہوں انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کے دفتر، رفاہِ عام کلب گولا گنج کو مطلع کرے۔ اپنے حلقوں کے اسکولوں میں اُردو طلبہ کو داخل کرانے۔ جناب امین سلونوی، سید امیر حسن نورانی، ساحر لکھنوی، اور سید فدا حسین صاحب ممبران انجمن ترقی اُردو نے بھی بڑی وضاحت کے ساتھ اُردو تعلیمی مہم پر روشنی ڈالی، ہر جگہ جلسہ کے آخر میں مشاعرہ ہوا۔ سرپرستوں اور شعرائے کرام نے اپنے بھرپور عملی تعاون کا یقین دلایا۔

جنرل سکریٹری کے پروگرام کے بموجب شہر بھر میں تقریباً پچاس جلسے کئے جائیں گے۔ کٹرہ اعظم بیگ، اشرف آباد اور منصور نگر کے حلقوں کے لئے حسب ذیل حضرات پر مشتمل کمیٹیاں بنادی گئی ہیں۔ کٹرہ اعظم بیگ، اشرف آباد، وسیم الدین قدوائی۔ ظفر عباس۔ ساجد حسن، محمود احمد مسعود صاحبان۔ منصور نگر:۔ سریش موہن دیال ایڈوکیٹ۔ شیخ عبداللہ۔ حافظ لکھنوی، بیڈھب لکھنوی، عطاء اللہ، راما نند صاحبان۔

حسب ذیل شعرائے کرام نے اُردو تحریک کے سلسلے میں مشاعروں میں شرکت کی۔

نقی کاظمی، حسرت وارثی، بسمل جائسی، حافظ لکھنوی، اختر دربھنگوی، اکبر ہردوئی، پیام سیہاروی، شفق شاہانی، شاداب لکھنوی، نہال رضوی، ماہر لکھنوی، امین سلونوی، سالک لکھنوی۔ بزرگ شعراء میں نادر لکھنوی، بیڈھب لکھنوی، آفتاب اور ساحر لکھنوی نے اپنے کلام سے کارکنانِ انجمن اور سامعین کو محظوظ فرمایا۔

(شجاعت علی۔ جنرل سکریٹری)

مراسلات

امام الہند پر تبصرہ

"ہماری زبان" کی اشاعت بابت ۸ر نومبر ۱۹۶۳ء میں جناب محمد عتیق صدیقی صاحب کا "تبصرہ" "امام الہند" پر شایع ہوا تھا۔ اس پر "ہماری زبان" کی اشاعت بابت یکم دسمبر ۱۹۶۳ء میں جناب تبسم کاشمیری صاحب کا ایک مراسلہ شایع ہوا ہے، جس میں صدیقی صاحب کے مراسلے کی مندرجہ ذیل عبارت :-

"ابوسلمان الہندی جیسے نوجوان پاکستانی کے قلم سے "امام الہند" جیسی کتاب نکلنا ہمارے لئے خوش گوار تجربہ ہے۔ یہ بات اس خوش آیند بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ پاکستان میں صالح ذہن بھی ہیں۔"

پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا گیا ہے :-

"تبصرے کا آخری فقرہ سخت متعصبانہ ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ کیا صدیقی صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں ان کی ذاتی پسند کے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ فاسد ذہنیت کے ہیں"؟

سب لوگوں کے لئے کسی ایک ذہنیت کا واقع ہونا یقیناً ناممکن ہے۔ عام طور پر کسی معاشرہ اور ملک کی عام ذہنیت کا اندازہ اس کے مخصوص افراد کی ذہنیت سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا آزاد کے لئے پاکستان میں عام ذہنی فضا کیا ہے؟ صحیح طور پر ہم ہندوستانی کیا جانیں؟ لیکن میں تبسم کاشمیری صاحب سے یہ ضروری عرض کروں گا کہ کسی معمولی فرد کی نہیں! ڈاکٹر سید معین الحق۔ ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈائریکٹر آف ریسرچ و جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی مندرجہ ذیل عبارت :-

"............ آزاد بلگرامی ہمارے عہد کے مولانا آزاد کی طرح غلط واقعات لکھنے کے عادی نہ تھے" [1]

کی روشنی میں، اس ذہنیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جس کے اظہار پر جناب تبسم کاشمیری صاحب نے اظہار برہمی فرمایا ہے۔

(سید فضل المتین)

[1] از کتاب سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ مرتبہ وحیدہ مسعود ناشر سلمان اکیڈمی۔ کراچی ۵ (پیش لفظ صفحہ ۱۹)

اردو مشترکہ زبان

"ہماری زبان" پابندی سے مل رہا ہے۔ اس بار (۸ر دسمبر) "سر زمین" کے تحت آپ نے اردو سے متعلق ایک انتہائی اہم پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض شخصیتوں نیز ادبی حلقوں کا یہ خیال بڑا مہلک ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا جائے اور اس طرح اس کے لئے وہ حقوق حاصل کئے جائیں، جو کسی اقلیتی زبان کا حصہ ہوتے ہیں، لیکن ان کی نظر اس نکتہ پر نہیں کہ یہ اردو کی ہمہ گیری کا کتنا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ اس پر قدرے تفصیل سے لکھئے۔

(حرمت الاسلام)

اردو اور تلگو کے درجے

شری میر احمد علی خاں وزیر عمارات و شوارع آندھرا پردیش نے اردو اور تلگو کے کلاسوں کا افتتاح کرتے ہوئے سرکاری ملازموں کو مشورہ دیا کہ وہ جلد از جلد تلگو اردو یا ہندی ٹسٹ کامیاب کرلیں۔ سرکاری احکام کے بموجب تلگو داں ملازمین کے لئے اردو یا ہندی، اور اردو داں ملازمین کے لئے تلگو ٹسٹ میں کامیابی حاصل کرنا ضروری ہے۔ مقررہ مدت میں یہ امتحانات کامیاب نہ کرنے والے ملازمین کے تدریجی اضافے روکے جاسکتے ہیں۔ اردو اور تلگو کی مفت تعلیم کے لئے کلاسوں کے انتظام کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو اور آندھرا سرسوت پریشد کی جانب سے جگہ اور فرنیچر مہیا کیا گیا ہے۔ شری میر احمد علی خاں نے دونوں جماعتوں میں علحدہ علحدہ بورڈ پر ابتدائی حروف لکھ کر افتتاح کی رسم ادا کی۔ اس موقع پر شری حبیب الرحمن معتمد انجمن ترقی اردو، اور ڈی راما راؤ سکریٹری آندھرا سرسوت پریشد نے بھی تقریریں کیں۔

عنقریب لال قلعہ کے پتھر منھ سے بولنے لگیں گے

(ہندوستان ٹائمز کے نامہ نگار کے حوالے سے) عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ لال قلعہ کے لال پتھر چمکنے لگیں گے اور گویا آنے جانے والوں سے خود بولنے لگیں گے۔ شعبۂ سیاحت نے حال ہی میں اس کا پائلٹ کی تجویز منظور کی ہے۔

منصوبے کے مطابق عمارت کے مختلف حصوں کو رنگین قمقموں سے روشن کیا جائے گا، اور اثر کو تیز تر اور منظر کو دل کش بنانے کے لئے حسب حال موسیقی کا انتظام کیا جائیگا۔

خاور جبل پوری

قاضی معراج کی یاد میں

موت اور زندگی لازم و ملزوم ہیں روزانہ واقف یا ناواقف لوگوں کے مرنے کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں سے ذاتی تعلق یا لگاؤ ہوتا ہے اُنکی موت کی خبر سُن کر دل و دماغ کو کافی صدمہ پہنچتا ہے۔

قاضی معراج دھولپوری کی وفات حسرت آیات نے دل و دماغ پر کچھ ایسا ہی اثر کیا۔ دو سال پیشتر اسی موسم میں دھولپور کی نمائش کے مشاعرہ میں شرکت کیلئے گیا تھا۔ وہاں جن صاحب کے دولت خانے پر مقیم ہوا تھا اُن کے ناقابل فراموش خلوص اور محبت کے ساتھ ہی قاضی صاحب سے خلوص ملاقات کی یاد بھی بھلائی نہیں جا سکتی۔

مجھے معراج صاحب سے غائبانہ تعارف حاصل تھا اس لئے دھولپور جانے سے پہلے ہی اُن سے ملاقات کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ دھولپور پہنچ کر اپنے میزبان سے قاضی صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی انھوں نے اسی وقت ایک صاحب کو بھیج کر قاضی صاحب کو بلا لیا حالانکہ انھیں تشریف لانے کی زحمت دینے کی بجائے میں خود ہی ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ لمبی سی سفید ڈاڑھی والے ایک بزرگ ہماری جائے قیام پر تشریف لا رہے ہیں۔ میں انھیں قابل تعظیم بزرگ سمجھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جب محترم میزبان نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ آپ ہی قاضی معراج ہیں۔

مجھے بڑی ندامت ہوئی کہ ایک سفید ریش بزرگ کو بلاوجہ یہاں آنے کی تکلیف دی گئی لیکن میرے دوست فیاض حسن گوالیاری اسسٹنٹ سیٹلمینٹ افسر نے جب یہ بتایا کہ قاضی صاحب گوالیار میں بسلسلۂ ملازمت ان کے ماتحت رہ چکے ہیں تو کچھ تسکین ہوئی۔ پھر بھی میں نے قاضی صاحب سے معذرت چاہی کہ "اگر مجھے آپ کی ریش مبارک کی طوالت کا علم ہوتا تو بھول کر بھی ایسی جسارت نہ کرتا"۔ قاضی صاحب کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور فرمایا کہ آپ میری ڈاڑھی سے نہ ڈریں میں آپ حضرات کی محفل میں بارِ خاطر نہیں ہوں گا۔

ہوا بھی یہی کہ جب تک قاضی صاحب ہمارے ساتھ رہے انھوں نے بزرگ صورت ہونے کے باوجود خود کو یار شاطر ہی ثابت کر کے دکھایا۔

قاضی صاحب انگریزی داں تھے مگر اردو کا ادبی ذوق جنون کی حد تک تھا۔ سخن فہمی کے ساتھ ہی اچھے خاصے شعر بھی کہہ لیتے تھے مگر اس قدر جز رس واقع ہوئے تھے کہ بے حد اصرار اور خوشامد پر بھی صرف ایک ہی غزل سنائی۔ شاید انھوں نے اپنے اشعار کسی ادبی رسالے میں بھی نہیں بھیجے۔ اگر ان کی قلمی بیاض مل جائے تو اس سے کافی استفادہ حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی ادبی تخلیق ہی ان کی معنوی اولاد ہے۔

اس دن دیر تک ادبی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ دوران گفتگو میں یہ بھی فرمایا کہ آج کل کے اکثر ادیب محدود مطالعہ اور عدم واقفیت سے کسی ادبی مسئلے کی قرار واقعی چھان بین نہیں کرتے، اور مجھ سے اُن کی خام کاریاں برداشت نہیں ہوتیں۔ اس لئے ان کے خلاف قلم اُٹھانا پڑتا ہے۔

قاضی صاحب کو تنقید و تبصرے پر بھی عبور تھا مگر جذبات پر خاطر خواہ قابو نہ پانے سے کبھی کبھی برہنہ شمشیر ہو جایا کرتے تھے وہ نہ صرف صاحب کمال اور بہترین ادیب تھے، بلکہ مجسمۂ اخلاق بھی تھے اور ہر ایک سے بخندہ پیشانی ملنے کے عادی تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور حافظہ دیر پا تھا۔ کسی غلط روایت کو سُن کر حوالۂ کتب کے ساتھ برجستہ صحیح نشاندہی کر دیتے تھے۔ ان کے ذاتی کتب خانے کی تعریف سُن کر اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرنے پر دوسرے دن صبح اپنے دولت کدے پر آنے کی دعوت دے گئے۔

شب کو بہت دیر تک مشاعرہ ہونے سے ہم لوگ صبح سو کر اُٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ قاضی صاحب نے آکر "اَلْمَوْتُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" کی اذان دے دی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر قاضی صاحب کے ہمراہ جب اُن کے دولت کدے پر پہنچے تو وہاں بھی پُر تکلف ناشتہ تیار تھا ان کے اصرار و انکسار نے دوبارہ ناشتہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

ناشتے کے بعد قاضی صاحب کے ذاتی کتب خانے کی سیر کی گئی۔ ان کے کتب خانے میں مطبوعہ اور قلمی نادر و نایاب کتابیں اور نسخے بھی محفوظ ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کتب خانے کی ساری کتابیں قاضی صاحب انجمن ترقی اُردو کو وقف کر چکے ہیں۔

قاضی صاحب کو ادبی تاریخ سے خاص مناسبت تھی اُن دنوں بے خود بدایونی پر مقالہ لکھ رہے تھے۔ مجھے بے خود کے حالات زندگی کی تلاش تھی۔ مقالہ مکمل ہو جانے پر ایک کاپی بھیجنے کا وعدہ، اور بے خود کے خود نوشتہ منظوم افسانے کا قلمی نسخہ مجھ سے منگا کر دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ لیکن اُردو ادب میں شائع ہونے سے پہلے ہمارے وعدوں کی تکمیل نہ ہو سکی۔

قاضی صاحب کا نام معراج الدین تھا انھوں نے کم و بیش ساٹھ سال کی عمر پائی۔ ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں اُن کے لئے راجپوتانہ گورنمنٹ سے ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔

قاضی صاحب ستھرے ادبی مذاق اور معیاری اخلاق کا بہترین نمونہ تھے جو بزم احباب میں اپنی جگہ خالی چھوڑ گئے۔ "خدا مغفرت کرے"

مصطفےٰ علی گڑھ

المنطق فی الشعر یا غالب کی منطق

منطق اور شاعری دو فن ہیں جُدا جُدا، منطق کا وظیفہ خطائے فکری سے ذہن کو محفوظ رکھنا ہے اور شاعری کا وظیفہ کیفیاتِ نفسانیہ سے منفعل و متاثر کرنا ہے، اس لئے منطق کو شعریات سے اور شاعر کو براہین و دلائل سے کچھ زیادہ سروکار نہیں ہوتا، ہاں بعض شعرا کا کلام منطقیت اور شعریت دونوں کا جامع ہے، جی چاہتا ہے کہ اساتذہ کے کلام سے کچھ ایسے اشعار پیش کروں جس سے شاعری کے آئینے میں منطق کا جلوہ نظر آئے اور یہ رونمائی اہل عقل اور اہل ادب دونوں کی تفریح خاطر اور دیدہ افروزی کا سامان ہو جائے۔

۱۔ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

محبوب کی گرمیِ محفل اور زیب و زینت کا سامان نباتات میں بوئے گل، جمادات میں دودِ چراغ محفل اور حضرتِ انسان میں نالۂ دل ہے، شاعر تفحص کی نظر سے دیکھتا ہے تو ان تینوں کو بزمِ محبوب سے نکلتے ہوئے پریشان پاتا ہے، اس لئے وہ ان جزئیات سے یہ کلیہ اخذ کرتا ہے کہ "جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا" دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ بزمِ محبوب سے جُدائی باعثِ پریشانی ہے، منطق میں پہلے طریقہ کو استقراء (Induction) کہتے ہیں اور دوسرے کو تعلیل (Causation) علمائے بدیع کی اصطلاح میں اس شعر میں "صنعتِ جمع" ہے۔

۲۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

نپولین کی انانیت نے دعویٰ کیا کہ "دشوار" کوئی لفظ ہی نہیں، شاعر اس فرعونیت کے خلاف احتجاج کرتا ہے، اور تواضعِ نفس کا مدلل سبق دیتا ہے، کہ اور تو اور، خود آدمی کو انسان ہونا (حالانکہ وہ انسان ہے) آسان نہیں (میسّر اسم مفعول ہے "تیسیر" کا بمعنی آسان کیا گیا) پھر کس مُنہ سے کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ ہر کام آسان ہے، اور دشوار کوئی بات نہیں۔

بے شک "حیوانِ ناطق" آدمی ہے کیونکہ سیدنا حضرت آدمؑ کی اولاد ہے، لیکن سے علم ہے کچھ اور شئے انسانیت ہے اور شئے، کتنا توتے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا۔ انسان ہونے کے لئے فضائل نفسانی کی ضرورت ہے، اور ان کا حاصل ہونا "رذائل" کے دور ہونے پر موقوف، اور یہ سب بڑی ٹیڑھی کھیر،

پہلا مصرع دعویٰ ہے اور دوسرا دلیل، اور یہ شعر جملہ مدلّلہ ہے، منطقی تقریر یہ ہے:۔ ہر کام کا آسان ہونا دشوار ہے کیونکہ دشوار نہیں تو آسان ہے اور آسان ہے تو آدمی کو انسان بننا بھی آسان ہے کیونکہ وہ ایک کام ہے حالانکہ یہ بہت دشوار ہے

پس ثابت ہوا کہ ہر کام کا آسان ہونا دشوار ہے۔

پہلے مصرع کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر کام آسان نہیں اور اس میں سلبِ عموم ہے اور دوسرے کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو بھی انسان ہونا آسان نہیں اور یہ ایک جزئیہ ہے، سالبہ Particular Negative، اور ظاہر ہے کہ سلبِ عموم کے ثبوت کے لئے ایک جزئیہ کا سلب بھی کافی ہے،

(تذییل) شاعر نے نہایت خوبصورت دلیل پیش کی کہ ہم خرما و ہم ثواب، وہ اگر نرا منطقی ہوتا تو بس یہی کہہ دیتا کہ "ہر کام آسان ہے" یہ ایک دعویٰ ہے اور اس دعویٰ کا غلط ہونا بھی آسان ہے اور جس دعویٰ کا غلط ہونا آسان وہ ساقط الاعتبار لہٰذا یہ دعویٰ ساقط الاعتبار، اور اگر اس دعویٰ کا غلط کرنا آسان نہیں، بلکہ دشوار ہے تو یہ دعویٰ کہ ہر کام آسان ہے خود غلط ہو گیا کیونکہ وہ بھی ایک کام ہے، ہاں! اہل ادب کے یہاں اس صنعت کو "اغراب" کہتے ہیں۔

۳۔ اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اس شعر میں محبوبِ حقیقی کی یکتائی کا ثبوت ہے "یعنی" توحیدِ ذاتی و صفاتی کا بیان ہے، دلیل قیاس شرطی متصلہ کی شکل میں ہے جسے Hypothetical Conjunctive Syllogism کہتے ہیں، اور حضرت امام غزالی کی اصطلاح میں اس کا نام "میزان التلازم" ہے۔

خلاصۂ دلیل یہ ہے کہ اگر اس میں دوئی کی بو بھی ہوتی تو وہ کہیں دوچار ہوتا، لیکن وہ کہیں دوچار نہیں ہوا، اس لئے اس میں دوئی کی بو بھی نہیں پس وہ یگانہ و یکتا ہے۔ سے

نظیرِ دوست ندیدم اگرچہ از مہ و مہر
نہادم آئینہا در مقابلِ رُخِ دوست

"جو دوئی کی بو بھی ہوتی" مقدم یا ملزوم Antecedant ہے اور "تو کہیں دوچار ہوتا" تالی یا لازم Consequent ہے اور منطقی قانون ہے کہ تالی کے ارتفاع و نفی سے مقدم کی نفی ہو جاتی ہے اس لئے دوچار نہ ہونا ثبوت ہے دوئی کی بو بھی نہ ہونے کا اور اسی کا نام ہے بالفاظِ دیگر "یگانہ و یکتا ہونا"

خوبی اس ثبوت میں یہ بھی ہے کہ نہ دیکھ سکنے کی علت بھی واضح ہو گئی یعنی "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ" کے معنی کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی ہو گیا۔

ہاں یہ بتانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ جہاں اس شعر میں منطق کی شوخی ہے وہاں ادب کی چاشنی بھی ہے۔ پہلے مصرع میں ترصیع کی شان ہے تو دوسرے میں محاورہ کی آن بان ہے اور "دوچار" ہونے کی نفی سے دوئی کی بو کی نفی لفظی حیثیت سے بھی کی گئی ہے،

۴۔ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اس شعر میں بیان ہے ایک عجیب "واردات" کا، کہ محبوب نے رقیب کو گالیاں دیں، لیکن وہ بھی، انہیں کھا کر بے مزا نہ ہوا، بلکہ اسے بھی وہ اچھی لگیں۔ یہ کیوں؟

۱۔ کیا اس لئے کہ رقیب کے پاس چاشنیٔ عشق ہے، یا

۲۔ اس لئے کہ گالیاں قند مکرر تھیں، پہلی بات تو مسلمات شعرا کے خلاف ہے، رقیب رو سیاہ تو بوالہوس ہوتا ہے، وہ کم بخت عشق کو کیا جانے، یہ نعمت اس کی قسمت ہی میں نہیں۔ مر بھی جائے تو عشق کا فتویٰ یہ ہے، ؎

کاش کم بخت کی کعبہ میں کوئی پھکوا دے
کوچۂ یار میں کیوں ڈھیر ہو بیگانے کا

اور گالیاں عام تجربہ بتاتا ہے کہ "تلخ ہوتی ہیں" کونین سے بھی زیادہ، اندر ان سے بھی بڑھ کر، پھر وہ میٹھی کیوں ہو گئیں؟

...... آ خاہ، معلوم ہوا کہ ۳۔ یہ لب نوشیں کی کار فرمائی ہے، لب لعلیں کی اعجاز نمائی ہے، جبھی تو وہ بد مذاق بے مزا نہ ہوا، طالبانِ جاں باز بے مزا نہ ہوتے تو کوئی تعجب نہ تھا، وہ تو ایسی باتوں پر یہی کہتے ہیں ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

پس رقیب کے بے مزا نہ ہونے سے شاعر نے شیریں لب پر استدلال کیا ہے اور اس استدلال میں Method of Residues سے کام لیا ہے، یعنی ایک چیز کے اسباب وغیرہ کی جامع فہرست مرتب کرنا اور ان میں سے ہر ایک کو فرداً فرداً ساقط کرتے جانا اور جو باقی رہ جائے اس کو حکم کا مدار علیہ قرار دینا یہاں بے مزا نہ ہونے کی وجہ نہ پہلی ہے نہ دوسری بلکہ تیسری، ہے اور یہی مدعا و مطلوب ہے،

یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ شاعر نے یہاں "کتنے شیریں" کہا ہے، بجائے شیریں وغیرہ وغیرہ نہیں کہا، کیونکہ اس شیرینی کا کیف، کم بے حساب، و بے اندازہ ہے جو نہ ریاضی کے عمل تحلیل و تعاکس سے اور نہ جبر و مقابلہ کے قاعدۂ مساوات سے معلوم ہو سکتا ہے۔ ع: لذت مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی،

مصطفیٰ! متوالے ہو گئے ہو! تم لب شیریں کی قدر کیا جانو؟ تم نہ خسرو ہو نہ فرہاد، نہ حافظ ہو نہ غالب، اور پھر ایک طالب علم کو ان باتوں سے واسطہ؟ تمہاری شیریں تو یہی ہے کہ یہ کون سا قیاس ہے،

ہاں صاحب! یہ قیاس ضمیر کہلاتا ہے، یہاں ایک چیز کے لئے کئی اسباب کا احتمال تھا، ایک کی طرف تو "رقیب" پر لہجے کا زور دے کر اشارہ کر دیا دوسرا سبب یعنی گالیوں کی تلخی بوجہ شہرت کے بیان کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اس لئے اسے قیاس ضمیر Enthymemes کہتے ہیں (باقی صحبت باقی)

تاشقند میں سردار جعفری کی سالگرہ

۲۹ر نومبر کی شام کو تاشقند میں بیرونی ممالک سے دوستی اور تہذیبی رابطوں کی انجمن اور ازبکستان کے ادیبوں کی انجمن کی طرف سے اردو کے شاعر علی سردار جعفری کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ایک تہنیتی جلسہ منعقد ہوا جلسے میں تاشقند یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ ازبک ادیبوں اور اردو دوستوں نے شرکت کی۔

مشہور ازبک ادیب اسعد مختار نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ موصوف نے اپنی صدارتی تقریر میں ازبکستان میں سردار جعفری اور دیگر شعرائے اردو کی مقبولیت کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر حقیقی شاعر کی طرح سردار جعفری کی شاعری بھی ان کے ملک و قوم کی آواز اور اس کے وقار کی ترجمان ہے۔ اس کے بعد جناب نبی محمدوف نے روسی زبان میں سردار جعفری کی زندگی، سرگرمیوں اور فکر و فن کے بارے میں ایک مبسوط مقالہ پڑھا۔ موصوف نے جعفری کے فکر و فن پر گورکی، مایاکوفسکی، ناظم حکمت اور لوئی اراگان کے اثرات کا ذکر کیا اور کہا کہ مایاکوفسکی کو ان کا معنوی استاد کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد تاشقند یونی ورسٹی میں اردو کے مہمان پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس نے تقریر کی۔ موصوف نے اپنے ایک ممتاز شاعر سردار جعفری کی قدر افزائی پر حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ازبکستان میں اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب صرف یہی نہیں کہ ازبکی اور اردو زبان میں قدیم لسانی اور تہذیبی رابطے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اردو شعر و ادب ان فنی روایتوں اور حقیقت نگاری کی ان قدروں کا حامل ہے جو سوویت ازبکستان کے لوگوں کو عزیز ہیں۔ تقاریر کے بعد روسی ازبکی اور اردو زبان میں سردار جعفری کا کلام پڑھ کر سنایا گیا۔

آخر میں حاضرین کے سامنے مبارک باد کا وہ تار پڑھ کر سنایا گیا جو دونوں انجمنوں کی طرف سے سردار جعفری کو ان کی پچاسویں سالگرہ پر بھیجا گیا۔ جلسے کی کارروائی شام کے چھ بجے سے آٹھ بجے تک جاری رہی۔

ہال کو سردار جعفری کی ایک بڑی تصویر اور ازبکستان، سوویت یونین اور ہندوستان کے سرکاری جھنڈوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ (قمر رئیس)

بقیہ

ہندی کے علاقے میں ثقافتی تعطل

کیا انگریزی اور اردو کی یہ جانشین زبان علم و دانش کی ایسی شخصیتیں پیدا کر سکتی ہے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس بے تکی ہندی کے ذریعہ مذکورہ بالا شخصیتوں کے مقابلے میں دوسرے، تیسرے، چوتھے یا پانچویں درجے کے لوگ ہی کہیں ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس ہندی نے ہماری قومی زندگی کے ہر شعبہ میں ایک پستی پیدا کر دی ہے؟ کیا عوامی محاوروں اور روزمرہ کو ترک کر کے اس بے ثمر زبان نے تہذیب و ثقافت کی کوئی خدمت انجام دی ہے۔ کیا اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلا کہ ہمارے زمانے کے لوگ بونے ہو کر رہ گئے؟ جو پرانے معیاروں کو برقرار رکھنے کی صورت میں دماغی اور ثقافتی اعتبار سے قدآور ثابت ہو سکتے تھے۔ اور ان سے اکثر وکٹوریہ اور قبل از وکٹوریہ زمانے کے ان دیو نما قوی ہیکل اشخاص کی برابری کا دعویٰ کر سکتے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

خلا۔ ہندی نے ایک خطرناک خلا پیدا کر دیا ہے۔ کھڑی بولی کے

نام سے جو جبڑا توڑ اور زبان مروڑ زبان پیش کی جا رہی ہے اس نے ہندی کے علاقے میں بھانت بھانت کی بولیاں پیدا کر دی ہیں۔ سنسکرت اور ہندی کے اس جابرانہ استعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بے زبان ہو کر رہ گئے۔ آنے والی نسلیں اچھے قسم کے نوجوانوں سے محروم ہو گئیں۔ غیر مہذب زبان کے نتیجے میں غیر مہذب کردار پیدا ہونے لگے، اور اس سے ہمارے نوجوانوں کے رویے اور برتاؤ میں بد تہذیبی سرایت کر گئی۔ طلبہ کی موجودہ بد نظمی ہماری ثقافتی زندگی کے لئے ایک خطرہ بن چکی ہے اور یہ بہت کچھ ہماری اردو روایات کے فقدان کا نتیجہ ہے، کیونکہ اردو ہی شائستگی، شرافت اور نفاست کی علمبردار تھی۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندی کے علاقے میں تعلیم کی حالت موجودہ ہندی نے افسوسناک حد تک بگاڑ دی ہے۔ ہم کو ان پریشان کن چونکا دینے والے تکلیف دہ سوالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ دیانتداری کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم کو اس تہذیبی جمود اور ثقافتی تعطل پر جو خود ہمارا پیدا کردہ ہے پریشانی گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کرنا چاہئے۔ اردو میں تربیت حاصل کئے بغیر اس خالص ہندی زبان میں کسی بھی مقصد سے مہارت حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اردو نے جو سماجی میل ملاپ پیدا کیا ہے اُسے غلطی سے ہم سماجی انتشار سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس ثقافتی اور سماجی ملاپ کے تاریخی عمل کی مخالفت نے ایک زبردست ثقافتی شگاف پیدا کر دیا ہے یہ ایک طرح کا زیرِ زمین ایٹمی دھماکہ تھا جس کے انتہائی مہلک اثرات برآمد ہوئے اور عمل ردِ عمل کا ایک منحوس چکر چل پڑا۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں تھی بلکہ اس میں تہذیبی زندگی کی تمام شائستگی پائی جاتی تھی، ہندی کو اس شائستگی اور حسنِ بیان کو قبول کر کے اپنانا چاہئے تھا۔ اور تعاون عمل کے ساتھ اس میں اور چار چاند لگانا چاہئے تھے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بے والی و وارث اور بے آب و گیاہ سرزمین میں ٹکریں مار رہے ہیں۔

الغرض ہندی علاقے میں اس ثقافتی جمود کے اسباب مختصر طور پر مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) انگریزی سے دشمنی اور اس کی بیخ کنی۔

(۲) اس اردو سے دشمنی اور اس کی حوصلہ شکنی جو ہندی کے ایسے محاوروں اور اصطلاحوں سے بھری پڑی ہے جن کو لاکھوں اور کروڑوں ہندوستانی روزمرہ اپنی بول چال میں بے تکلفانہ استعمال کرتے ہیں۔

ان دونوں زبانوں کی جگہ اس موجودہ بے تکی ہندی کو ٹھونسنا خود ہندی پر ظلم کرنا ہے۔ کیا خطرہ سے آگاہ کرنا ہندی کے خلاف ناانصافی ہے؟"

ریاستوں میں تعلیمی یکسانیت پیدا کرنے کی شدید ضرورت

مرکزی وزیر تعلیم مسٹر ایم. سی. چھاگلا نے لوک سبھا میں مسٹر جیونت مہتا (پی. ایس. پی.) کے سوال پر نصف گھنٹے کی بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اسکولوں میں زبانوں کی تعلیم کے سلسلے میں تمام ریاستوں کے اندر یکساں پالیسی اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ اکثر مدارس میں موجودہ رنگ برنگے طریقوں نے ایک انتشاری حالت پیدا کر رکھی ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی ریاستوں سے درخواست کرنے والے ہیں کہ قومی یکجہتی کے مفاد کے پیشِ نظر وہ اپنے اختیارات کے تھوڑے سے حصے سے دستبردار ہو جائیں اور مرکز کو کچھ اختیارات سپرد کر دیں۔

موصوف نے ممبران کو یقین دلا دیا کہ تعلیم کی موجودہ صورت حال سے وہ قطعی غیر مطمئن ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ کسی ڈام کے بنانے میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا ازالہ ہو سکتا ہے لیکن تعلیمی پالیسی کی غلطی سے خطرناک نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔

وزیر تعلیم نے کہا کہ انگریزی تعلیم کا معیار گھٹ جانے سے پوری نسل متاثر نظر آتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو طلبہ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں ان کے پاس حسبِ ضرورت انگریزی کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ لیکچروں کو سمجھ نہیں پاتے۔ وہ ممبران کو یہ بنیادی حقیقت یاد دلانا چاہتے تھے کہ خواہ پرائمری درجوں میں تعلیم مادری زبان میں ہی کیوں نہ ہو پھر بھی انگریزی تعلیم کی طرف کافی توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہندی جب تک وفاقی زبان نہیں بنے گی انگریزی برابر جاری رہے گی۔ اس کے بعد بھی انگریزی کی اہمیت باقی رہے گی کیونکہ یہ سائنس کی زبان ہے اور ہمارے لئے ایک عالمی ذریعہ ہے۔ علاوہ اس کے اگر کل ہند تعلیمی سروس کو واقعی طور پر عمدگی سے چلانا ہے تو انگریزی تعلیم کو اور بھی مستحکم بنانا ہوگا۔ کیونکہ ایک مضبوط اور طاقتور ذریعہ تعلیم کے بغیر یہ سروس صحیح طور پر کام نہیں کر سکتی اور یہ ذریعہ اس وقت صرف انگریزی بہم پہنچا سکتی ہے۔

ڈی شرما (کانگریس) کے سوال کے جواب میں مسٹر چھاگلا نے کہا موجودہ حالت میں مختلف درجوں میں انگریزی کی تعلیم متعدد ریاستوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ کیرالا اور مغربی بنگال میں انگریزی تیسرے درجے سے شروع ہوتی ہے اور کچھ ریاستوں میں چھٹے سے، اور گجرات میں آٹھویں درجے سے کم میں نہیں پڑھائی جاتی۔ مسٹر چھاگلا نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ تعلیم کے یکساں کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ یہاں ہونے والی متعدد کانفرنسوں میں ریاستی

وزراء اکثر اس بات پر متفق ہو گئے کہ تعلیمی پالیسی میں یکسانیت ہونی چاہئے۔ لیکن جونہی وہ اپنی ریاست کو واپس ہوئے سب وعدے بھول گئے۔ اور کیونکہ اسکولی تعلیم آئین میں کلیتاً ریاستی موضوع ہے اس لئے مرکز اپنا کوئی فیصلہ ان پر ٹھونس نہیں سکتا۔

علاقائی زبانوں کے متعلق وزیر تعلیم کا اظہار خیال

مرکزی وزیر تعلیم ایم سی چھاگلا نے وزارت تعلیم کی پارلیمانی مشاورتی کمیٹی کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زبان کی بناء پر ریاستوں کی تقسیم کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اسکولوں اور کالجوں میں ایک نہ ایک روز علاقائی زبانیں ہی ذریعہ تعلیم بنیں گی۔ لیکن جلد بازی سے کام لینا نقصان دہ ہوگا۔ یونیورسٹیوں میں علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا کام بتدریج ہونا چاہئے۔ یہ تبدیلی اس طرح ہو کہ ملک کا اتحاد پارہ پارہ نہ ہونے پائے ہر یونیورسٹی خود ہی طے کرے کہ یہ تبدیلی کتنے دنوں میں ہو لیکن اس بات کا لحاظ رہے کہ تعلیم کا معیار گرنے نہ پائے۔ موصوف نے کہا کہ وہ کل ہند تعلیمی سروس قائم کریں گے جس کا کام یہ ہوگا کہ تعلیم کے میدانوں میں مختلف ریاستوں کے مشترک تعلق کو مضبوط بنایا جائے۔

کمیٹی میں ممبروں نے زور دیا کہ علاقائی اور ہندی زبانوں کی ایک معیاری لغت تیار کی جائے۔ بعض ممبروں نے یہ رائے بھی دی کہ اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری مرکزی حکومت کو قبول کرنا چاہئے۔ شری چھاگلا نے کہا کہ ہندی زبان کو مختلف ریاستوں کے درمیان واسطہ بنانے کی کوشش کی جائے اور انگریزی زبان کو غیر ملکوں سے رشتہ جوڑنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم کیا ہو؟ یہ مسئلہ اہم، مشکل اور اختلافی ہے۔ اب تک انگریزی زبان یونیورسٹیوں کی مشترک زبان رہی ہے۔ لسانی علاقوں کی تشکیل کے بعد علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانا ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں عاجلانہ اقدام سے بچنا چاہئے۔ ایسا قدم نہیں بڑھانا چاہئے جس سے ملک کا اتحاد اور مفاد خطرے میں پڑ جائے۔ سائنسی دنیا میں نئی تبدیلیاں اس طرح تیزی کے ساتھ ہو رہی ہیں کہ علاقائی زبانوں کے لئے ممکن نہیں کہ وہ مستقبل قریب میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بن سکیں۔ ہندوستان کا انگریزی زبان سے بہت قریبی تعلق ہے سائنس اور ٹیکنکل تعلیم کے لئے کسی دوسری غیر ملکی زبان کا سیکھنا ہندوستانیوں کے لئے قریب قریب مشکل ہے۔

انگریزی ہی کے دروازے سے ہندوستان بین الاقوامی دنیا میں پہنچ سکتا ہے۔

دوسرے فنون کے طلبہ کے لئے انگریزی اس قدر ضروری نہیں۔ لیکن جب تک یونیورسٹیوں میں انگریزی تعلیم رہے اس وقت تک ثانوی اسکولوں میں انگریزی کا معیار بہتر بنانا چاہئے۔

ممبروں نے سنسکرت کی تعلیم کی اہمیت پر بھی زور دیا

اُردو داں اساتذہ کی ٹریننگ

انجمن ترقی اُردو بیدر کے ایک وفد نے وزیر تعلیم میسور کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ بیدر میں اُردو داں اساتذہ کی ٹریننگ کے لئے ایک ٹریننگ سینٹر کھولا جائے۔ اُردو زبان میں تعلیم پانے والے بچوں کے لئے اُردو جماعتیں کھولی جائیں، اور اُن کے لئے اُردو داں اساتذہ کے تقررات عمل میں لائے جائیں۔ وزیر تعلیم نے جواب دیا کہ بیدر یا حیدر آباد کرناٹک میں اساتذہ کے لئے ٹریننگ سینٹر کھولنے کا موجودہ حالات میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ریاست میں ٹریننگ سینٹر موجود ہے۔ سینٹر کی دوری کے پیش نظر وہ اُردو داں اساتذہ کو حیدرآباد بھیجنے کی سہولتوں پر غور کریں گے۔ اور موصوف نے اُردو داں اساتذہ کی کمی کو دور کرنے اور اُردو جماعتیں کھولنے کا بھی وعدہ کیا۔

۶۰۴ ہندوستانی کتابوں کا روس کی ۲۸ زبانوں میں ترجمہ

بمبئی میں روسی سفارت خانہ کے مسٹر آئی این بوتی نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ ہندوستان کی ۶۰۴ کتابیں روس کی ۲۸ زبانوں میں ترجمہ کر کے چھاپی گئی ہیں، ان کتابوں میں مہاکوی ٹیگور، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اس وقت روس میں ترجمہ ہو کر شائع ہونے والی ہندوستانی کتابوں کی اشاعت کی تعداد ایک کروڑ ستر لاکھ سے بھی زائد ہے۔ ہندوستانی کتابوں کا ترجمہ براہ راست ہند کی زبانوں سے کیا جاتا ہے۔ اس وقت روس میں رابندر ناتھ ٹیگور کی بارہ کتابوں کا ایک سیٹ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سیٹ کی پہلی کتاب شائع ہو چکی ہے، اور لوگ اسے ذوق و شوق سے پڑھ رہے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اُردو علی گڑھ سے شائع کیا